

متفرق سوالات

[المورد میں خطوط اور ای میل کے ذریعے سے دینی موضوعات پر سوالات موصول ہوتے ہیں۔ المورد کے شعبہ علم و تحقیق اور شعبہ تعلیم و تربیت کے رفقاء اس سوالوں کے جواب دیتے ہیں۔ ان میں سے منتخب سوال و جواب کو افادہ عام کے لیے یہاں شائع کیا جا رہا ہے۔]

ذبح کے وقت تکبیر کی کیسٹ چلانا

سوال: مغرب کے بعض ممالک میں حلال گوشت بیچنے والے اداروں میں ذبح کرنے کے طریقے میں دو مسائل سامنے آئے ہیں، ان پر آپ اپنی رائے دیں۔

۱۔ مرغیوں کو ذبح کرنے سے پہلے بجلی کا جھٹکا دیتے ہیں تاکہ وہ زیادہ بھاگ نہ سکیں، بعض اوقات کچھ جانور اس جھٹکے سے مر بھی جاتے ہیں۔

۲۔ جب انھیں ذبح کیا جاتا ہے تو اس وقت منہ خانے میں تکبیر کے الفاظ پر مشتمل کیسٹ چلائی جاتی ہے۔ کیا ایسے اداروں کا تیار کردہ گوشت حلال ہے؟ (نثار احمد)

جواب: پہلی بات یہ ہے کہ اگر واقعہً بجلی کے جھٹکے سے مر جانے والے جانوروں کو ذبح ہونے والے جانوروں سے الگ نہیں کیا جاتا، بلکہ انھی میں ڈال دیا جاتا ہے تو پھر اس ادارے کا تیار کردہ گوشت استعمال نہیں کرنا چاہیے۔

جہاں تک منہ خانے میں ذبح کے وقت تکبیر کی کیسٹ چلانے کا تعلق ہے تو یہ کوئی صحیح بات تو نہیں ہے، لیکن ذبح کرنے والا ادارہ چونکہ جانور کو اسی ذات کے نام پر ذبح کر رہا ہے جس کے نام پر اسے ذبح ہونا چاہیے، لہذا جانور کو

ذبیحہ قرار دینے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ البتہ، اگر مسلمانوں کا کوئی گروہ یہ طریقہ اختیار کرتا ہے تو اسے اس سے منع کرنا چاہیے۔

اہل کتاب کا ذبیحہ

سوال: قرآن مجید میں اہل کتاب کا ذبیحہ مسلمانوں کے لیے جائز قرار دیا گیا ہے۔ کیا آج کل کے اہل کتاب جو مشرکانہ عقائد رکھتے ہیں، ان کا ذبیحہ بھی مسلمانوں کے لیے جائز ہے؟ (نثار احمد)

جواب: اہل کتاب آج جس شرک میں مبتلا ہیں، اس میں وہ نزول قرآن کے زمانے میں بھی تھے۔

ارشاد باری ہے:

وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللَّهِ وَقَالَتِ النَّصَارَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللَّهِ ذَلِكَ قَوْلُهُمْ بِأَفْوَاهِهِمْ. (التوبہ: ۳۰)

”یہود نے کہا: عزیر اللہ کا بیٹا ہے، اور نصاریٰ نے کہا: مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔ یہ سب ان کے منہ کی باتیں

ہیں۔“

اہل کتاب اپنے دین کو دین توحید ہی کی حیثیت سے پیش کرتے اور اپنے شرک کی توجیہ کرتے ہیں، لہذا قرآن نے انھیں عرب کے ان مشرکین کی صف میں کھڑا نہیں کیا جو دین توحید کے بجائے دین شرک کے علم بردار تھے۔ لہذا، آج بھی اہل کتاب کا ذبیحہ کھانا صحیح ہوگا بشرطیکہ وہ ذبیحہ ہو۔

ذات خدا کے متعلق دلیل ڈھونڈنا

سوال: کیا اسلام میں اپنے ایمان کی بنیاد کے بارے میں دلیل ڈھونڈنے کی اجازت ہے، مثلاً یہ کہ ہر چیز کی کوئی ابتدا ہوا کرتی ہے تو اللہ کی ابتدا کیا ہے، یعنی وہ کب سے موجود ہے اور وہ کہاں سے آیا ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس طرح کے سوالوں کے جواب تلاش کرنا ہی کفر ہے۔ (سید عمر حسنی)

جواب: خدا پر ایمان عقل و فطرت کی گواہی سے یا ان دونوں کے اطمینان پا جانے کی بنا پر ہوتا ہے۔ لہذا، خدا پر ایمان لانے کے حوالے سے دلیل و استدلال کی نفی کرنا درست نہیں ہے۔

البتہ ذات خدا سے متعلق ایسے سوال جیسے آپ نے بیان کیے ہیں کہ ہر چیز کی کوئی ابتدا ہوا کرتی ہے تو اللہ کی ابتدا کیا ہے، وہ کب سے موجود ہے اور کہاں سے آیا ہے؟ ان سوالات کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کرنا آخری درجے کی حماقت اور جہالت ہے، کیونکہ ذات خدا کے بارے میں وہ معلومات ہی ہمارے پاس موجود نہیں جن کی بنیاد پر ایسے سوالوں کے جواب تلاش کرنا ممکن ہو۔

ہم یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ اس کائنات میں موجود نظم و ضبط، توازن اور اشیا میں ہم آہنگی ہمیں اس بات کی طرف دھکیلتی ہے کہ اس کے پیچھے کوئی عظیم قدرت اور ذہانت موجود ہے جو با مقصد کام کرتی ہے۔

اگر ہم اس قدرت اور ذہانت کی ذات کے بارے میں، جسے ہم اس کائنات کا مقتدر مان رہے ہیں، کچھ جاننا چاہتے ہیں تو ضروری ہے کہ جیسے یہ کائنات ایک حد تک ہماری دسترس میں ہے، اسی طرح وہ ذات بھی کسی نہ کسی حد تک ہماری دسترس میں ہوتا کہ جیسے اس کائنات کے مطالعے سے ہم نے یہ بات اخذ کی ہے کہ اس کے پیچھے ایک قدرت اور ذہانت کارفرما ہے، اسی طرح ہم اس ذات کے مطالعے سے یہ طے کریں کہ اس کے پیچھے کون کارفرما ہے اور کب سے کارفرما ہے؟

ان سوالوں کے حوالے سے ہمارے محقق کا مسئلہ بس اس ذات تک پہنچنا ہے، جو نہی وہ اس تک پہنچ جائے گا، اگلی تحقیقات آپ سے آپ شروع ہو جائیں گی۔ اگر وہ ذات بھی کائنات ہی کی اشیا کی طرح کی کوئی شے ہوئی تو پھر اسے مادی اصولوں پر پرکھ کر اس کے بارے میں کچھ کہنا ممکن ہوگا۔

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا خدا کو مخلوقات کی صف میں کھڑا کیا جاسکتا ہے؟ کیا وہ بھی اسی طرح زمان و مکان کا پابند ہے جیسے اس کائنات کی دوسری چیزیں پابند ہیں؟ کیا وہ کائنات کے اندر ہی کا ایک وجود ہے کہ ہم اس تک پہنچنے کی کوشش کریں؟ اگر وہ بھی مخلوقات میں سے ایک مخلوق ہے تو پھر اس کے بارے میں ہمارے ایسے سوالات بامعنی ہیں، لیکن اگر وہ مخلوق نہ ہو تو پھر شاید وہ ہمارے علم و عقل سے بالا وجود ہو اور اسے سمجھ سکنا ہمارے بس میں نہ ہو، کیونکہ ہم صرف مخلوقات ہی سے واقف ہیں۔

ہم اسے اس لیے مانتے ہیں کہ یہ کائنات اور ہمارا اپنا وجود اسے ماننے کی طرف ہمیں دھکیلتا ہے اور حیرت کی بات یہ ہے کہ وہی اس کائنات کی وہ واحد توجیہ ہے جو ہمارے سب سوالوں کا شافی جواب ہے۔

اب رہا اس کی ذات کا معاملہ کہ وہ کہاں سے آیا ہے اور کب سے موجود ہے تو یہ معلوم کرنے کے لیے اس کے وجود تک پہنچنا، اس کا مشاہدہ و مطالعہ کرنا اور غور و فکر کے لیے بنیادی مواد حاصل کرنا ضروری ہے۔

بہر حال، حقیقت یہ ہے کہ فی الحال ہم مادے تک رسائی تو رکھتے ہیں، مگر اس کے پیچھے عقلاً محسوس ہونے والی ذہن تک ہماری کوئی رسائی نہیں ہے۔

اس صورت حال میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟

اس سوال کے دو جواب ہیں:

ایک یہ ہے کہ جب تک ہم خدا کی ذات کا مطالعہ کر کے اس کے بارے میں یہ نہیں جان لیتے کہ وہ کب سے ہے اور کہاں سے آیا ہے، اس وقت تک کے لیے ہم کائنات کے پیچھے کسی قدرت اور ذہانت کے کارفرما ہونے اور اس کائنات میں کسی مقصدیت کے موجود ہونے ہی سے انکار کر دیں یا دوسرے لفظوں میں اس وقت تک کے لیے ہم خدا کے وجود پر اس کائنات کی اور اپنے وجود کی صریح گواہی کا انکار کر دیں اور اس پر اپنے ایمان لانے کو اس وقت تک کے لیے موخر کر دیں، جب تک ہمیں یہ نہ پتا چلے کہ آخر وہ آیا کہاں سے ہے اور وہ کب سے ہے۔

ہمارے اس رویے کی مثال یہ ہوگی کہ جس شخص کے والدین کے بارے میں ہمیں یہ معلوم نہیں ہوگا کہ وہ کون ہیں، ہم اس شخص کے وجود کے بارے میں اپنے وجود کی ہر گواہی کا انکار کریں گے۔

دوسرا یہ ہے کہ جو کچھ ثابت ہو چکا ہے، اس کو مانا جائے۔ چنانچہ اگر یہ بات ثابت ہے کہ اس کائنات کے پیچھے کوئی قدر، کوئی حکیم ہے تو اسے مانا جائے، یعنی اس پر ایمان لایا جائے اور اس کی ذات سے متعلق سوالات کا جواب جاننے کے لیے اس تک پہنچنے کا انتظار کیا جائے اور ان سوالوں کو فی الحال معلق رہنے دیا جائے، کیونکہ اس وقت ان پر غور و فکر ہمارے بس ہی میں نہیں ہے۔

ویسے یہ بات بھی غور طلب ہے کہ کیا یہ ضروری ہے کہ خدا کی ابتدا ہو؟ خدا کی ابتدا نہ ہونے سے یہی بات ثابت ہوگی کہ وہ ہماری معلوم اشیا کی طرح کی شے نہیں ہے۔ اگر وہ موجود ہے تو اس کے بارے میں یہ بات بھی ممکن ہے کہ وہ کائنات کی اشیا کی طرح کا نہ ہو۔ ہم اس کے بارے میں یہ سوال کہ وہ کب سے ہے اور وہ کہاں سے آیا ہے، آخر کس بل بوتے پر کر رہے ہیں۔

غور و فکر کفر نہیں ہوتا۔ کفر دراصل، اس حق کو نہ ماننا ہے جو آپ پر بالکل واضح ہے، جس کے بارے میں آپ کا دل کہتا ہے کہ آپ کو اسے لازماً قبول کرنا چاہیے، لیکن آپ جان بوجھ کر اسے نہیں مانتے۔

حدیث کے بارے میں قرآن کی وضاحت

سوال: قرآن مجید حدیث کے بارے میں کیا کہتا ہے؟ (خالد احمد خاں)

جواب: قرآن مجید نے حدیث کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ البتہ، اس نے صاحب حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بہت سی باتیں کی ہیں، یعنی یہ کہ آپ کی اطاعت کی جائے، آپ کی اتباع کی جائے اور آپ کے اسوۂ حسنہ کو اپنایا جائے۔

جرم اور گناہ

سوال: جرم اور گناہ میں کیا فرق ہے؟ دونوں میں کیا اشتراک ہے اور کیا اختلاف ہے؟ (عالیہ انور)

جواب: گناہ خدا کے حکم کو نہ ماننا ہے۔ خواہ یہ حکم کسی کام کو سرانجام دینے کا ہو یا کسی کام سے رکنے کا ہو اور خواہ یہ حکم شریعت سے ثابت ہو یا فطرت سے مثلاً، انکارِ نبوت، نماز میں کوتاہی، ماں باپ سے بدسلوکی، وعدہ خلافی اور جھوٹ بولنا وغیرہ۔

جرم کا لفظ جب آخرت کے زاویے سے بولا جاتا ہے تو اس سے مراد کسی گناہ پر ہٹ دھرمی کے ساتھ اصرار و استمرار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہنمیوں سے کہا گیا کہ 'اِنَّكُمْ مُّجْرِمُوْنَ'، 'یقیناً تم مجرم ہو' (المزمل ۷۷: ۴۶) اور اِنَّ الْمُجْرِمِیْنَ فِی ضَلٰلٍ وَّ سُعُرٍ، 'بے شک مجرم گمراہی میں ہیں اور جہنم میں ہوں گے' (القمر ۵۴: ۴۷) اور وَ كَانُوا یُصِرُّوْنَ عَلٰی الْحِنْتِ الْعَظِیْمِ، 'اور وہ سب سے بڑے گناہ (شرک) پر اصرار کرتے رہے' (الواقعة ۵۶: ۴۶)۔

اور جب قانون و فقہ کے زاویے سے بولا جاتا ہے تو اس سے مراد وہ گناہ ہیں جن پر شریعت نے دنیا میں سزا دی ہے، مثلاً قتل، چوری، قذف اور زنا وغیرہ۔

بہتان اور طلاق

سوال: اگر کوئی شخص اپنی بیوی پر شک کرتے ہوئے یہ الزام لگائے کہ وہ اس کے بعض رشتہ داروں پر جادو کر رہی ہے یا کر رہی ہے، پھر وہ خاتون قرآن پر ہاتھ رکھ کر اپنی معصومیت کی قسم کھالے کہ اس نے اس طرح کا کوئی جادو وغیرہ نہیں کیا تو کیا مذکورہ خاوند اپنی بیوی پر جادو کا یہ بہتان لگانے کے بعد اس کے ساتھ رہ سکتا ہے؟ (عبداللہ خان)

جواب: کیوں نہیں رہ سکتا، بالکل رہ سکتا ہے۔ جب بیوی سے قسم لے لی ہے تو اس کے بعد خاوند کا اعتماد بحال ہو جانا چاہیے اور میاں بیوی کی باہمی محبت واپس لوٹ آنی چاہیے۔
یہ بات ذہن میں رہے کہ اس واقعے میں بے شک خاوند نے بیوی پر شک کیا ہے اور اس پر ایک بہتان لگایا ہے، لیکن اس طرح کی کسی بات کا اثر ان کے نکاح پر نہیں پڑتا، لہذا اس پہلو سے پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔

جادو اور اس کا روحانی علاج

سوال: کیا جادو یا کالام کوئی حقیقت رکھتا ہے؟ اور کیا اس کا روحانی علاج کرنا درست ہے؟ اور کیا ہم عملیات پر یقین رکھ سکتے ہیں؟ (ارشاد اسلام)

جواب: ارشاد باری ہے: ”وَمِنْ شَرِّ النَّفَّاثَاتِ فِي الْعُقَدِ“ (یعنی میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں) گرہوں میں پھونک مارنے والیوں کے شر سے۔“ (الفلق ۱۱۳: ۴)
اس آیت سے یہ پتا چلتا ہے کہ جادو کرنے والوں کا ایک شر ہے جس سے بچنے کے لیے ہمیں یہ کلمہ سکھایا گیا ہے۔ اور ارشاد باری ہے:

”اور یہ (یہودی) ان چیزوں کے پیچھے پڑ گئے جو سلیمان کے عہد حکومت میں شیاطین پڑھتے پڑھاتے تھے... یہی (شیاطین) لوگوں کو جادو سکھاتے تھے۔“ (البقرہ ۲: ۱۰۲)
چنانچہ جادو یا کالام ایک حقیقت ہے، اس کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔

عام مشاہدے میں جو چیز آئی ہے، وہ یہ ہے کہ جس شخص پر کالا جادو کر دیا جائے، وہ شدید توہمات میں گھر جاتا ہے، بعض صورتوں میں وہ سخت بیمار ہو جاتا ہے اور اسے عام علاج معالجے سے بھی کوئی شفا نہیں ہوتی۔ جادو وغیرہ کے لیے روحانی علاج کرنا درست ہے۔ البتہ، تعویذ گنڈے کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مکروہ جانا ہے۔ ابو داؤد کی ”کتاب الخاتم“ میں ایک مفصل حدیث بیان ہوئی ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم دس چیزوں کو مکروہ جانتے تھے، ان باتوں میں سے ایک تعویذ باندھنا بھی ہے۔

خود دین نے اس کے توڑ کے لیے جو روحانی علاج بتایا ہے، وہ معوذتین کا پڑھنا ہے۔ یہ دونوں سورتیں دراصل، جادو اور بعض دوسرے شرور سے خدا کی پناہ حاصل کرنے کی دعائیں ہیں۔ یہ اگر پورے یقین کے ساتھ پڑھی جائیں تو ان سے بڑھ کر اور کوئی چیز نہیں ہے۔

اس کے علاوہ اگر آپ کسی روحانی عامل سے علاج کرانا چاہیں تو کرا سکتے ہیں، بس یہ دیکھ لیں کہ وہ کوئی شرکیہ عمل اختیار کرنے والا نہ ہو اور دھوکا باز نہ ہو۔

عملیات پر یقین رکھنے کے الفاظ درست نہیں ہیں، کیونکہ اس میں وہ سب کچھ بھی آ جاتا ہے جو انسانوں کی ایجاد ہے۔

البتہ اشیا اور کلمات کے خواص اور ان کی تاثیرات کا علم ایک حقیقت ہے۔ قرآن مجید میں ہاروت و ماروت کے حوالے سے جس علم کا ذکر کیا گیا ہے، عام طور پر اسے جادو سمجھا گیا ہے، لیکن مولانا امین احسن مرحوم نے واضح کیا ہے کہ وہ اشیا اور کلمات کے خواص اور ان کی تاثیرات کا علم تھا۔

البتہ ہر مسلمان کے لیے یہ یقین رکھنا ضروری ہے کہ جادو ہو یا روحانی علم، ان میں تاثیر اللہ ہی کے اذن سے پیدا ہوتی ہے۔ خدا کے علاوہ کوئی چیز بھی بذات خود کوئی تاثیر نہیں رکھتی۔

بیت المقدس اور تحویل قبلہ

سوال: قرآن میں کس جگہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ آپ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھیں، اگر نہیں دیا گیا تو آپ نے ایسا کیوں کیا؟ (بابا علی)

جواب: یہ بات تو قرآن مجید سے ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ ماہ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز نہیں پڑھی۔

ارشاد باری ہے:

۱۔ سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَّهُمْ عَن قِبَلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا. (البقرہ ۲: ۱۴۲)

”(ابراہیم کی بنائی ہوئی مسجد کو، اے پیغمبر، ہم نے تمہارے لیے قبلہ ٹھہرانے کا فیصلہ کیا ہے تو) اب ان لوگوں میں سے جو احمق ہیں، وہ کہیں گے: انہیں کس چیز نے اُس قبلے سے پھیر دیا جس پر یہ پہلے تھے؟“

۲۔ وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَن يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّنْ يَنْقَلِبُ عَلٰی

عَقِبَيْهِ. (البقرہ ۲: ۱۴۳)

”اور اس سے پہلے جس قبلے پر تم تھے، اُسے تو ہم نے صرف یہ دیکھنے کے لیے ٹھہرایا تھا کہ کون رسول کی پیروی کرتا ہے اور کون الٹا پھر جاتا ہے۔“

۳۔ قِبْلَةً تَرْضَاهَا فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ. (البقرہ ۲: ۱۴۴)

”(اے پیغمبر)، سو ہم نے فیصلہ کر لیا کہ تمہیں اُس قبلے کی طرف پھیر دیں جو تم کو پسند ہے، لہذا اب اپنا رخ مسجد حرام کی طرف پھیر دو۔“

آیات نمبر ۱ اور ۲ اور ان کے ترجمے میں موجود خط کشیدہ الفاظ میں بیت اللہ کا ذکر نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ کس قبلے کا ذکر ہے؟

آیت نمبر ۳ میں بیت اللہ کی طرف آپ کا رخ پھیر دینے کا ذکر ہے۔ سوال یہ ہے کہ آپ کے رخ کو کدھر سے ادھر پھیرا جا رہا ہے۔

قرآن کی یہ آیت کہ ’سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ‘ (عنقریب یہ بے وقوف (یہود) کہیں گے)، بتاتی ہے کہ یہ یہود کا پسندیدہ قبلہ ہے۔ چنانچہ ظاہر ہے کہ یہ بیت المقدس ہی ہے۔ وراحدیث بھی بتاتی ہیں کہ وہ بیت المقدس ہی ہے۔ قرآن مجید کے اس مقام کی مختصر وضاحت یہ ہے کہ مکہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم خانہ کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے، البتہ آپ اس بات کا اہتمام ضرور کرتے تھے کہ آپ اس رخ پر کھڑے ہوں جس پر خانہ کعبہ اور بیت المقدس، دونوں ہی قبلے آپ کے سامنے آجائیں، اس کی وجہ یہ تھی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت تک اہل کتاب سے مختلف کوئی طریقہ اختیار نہ کیا کرتے تھے، جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو اس کا حکم یا اس کی اجازت نہ مل

جاتی تھی۔

پھر جب آپ مدینہ میں آئے تو وہاں دونوں قبلوں کو بہ یک وقت سامنے رکھنا ممکن نہ تھا، لہذا آپ نے اپنے اصول کے مطابق بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا شروع کر دی، لیکن آپ کا جی یہ چاہتا تھا کہ آپ خانہ کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھیں۔ پھر جیسا کہ درج بالا آیات سے معلوم ہوتا ہے، کچھ ہی عرصہ بعد اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ حکم دے دیا کہ آپ کعبہ ہی کو اپنا قبلہ بنائیں۔

نکاح میں گواہوں کی شرط

سوال: کیا نکاح میں گواہ ہونے ضروری ہیں؟ اگر کوئی مرد و عورت کسی ایسی مجبوری میں ہیں کہ وہ گواہوں کی موجودگی میں نکاح نہیں کر سکتے تو کیا بغیر گواہی کے ان کے ایجاب و قبول سے ان کا نکاح واقع ہو جائے گا؟ (مقصود احمد)

جواب: نکاح سے متعلق شریعت کو عادی صاحب نے اپنی کتاب ”میزان“ کے باب ”قانون معاشرت“ میں درج ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے:

”وَأَحْلَلْ لَكُمْ مَا وَرَاءَ ذَلِكَ أَنْ تَبْتَغُوا بِأَمْوَالِكُمْ، مُحْصِنِينَ غَيْرَ مُسَافِحِينَ، فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهِ مِنْهُنَّ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ فَرِيضَةً، وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِي مَا تَرَضَيْتُمْ بِهِ مِنْ بَعْدِ الْفَرِيضَةِ، إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا. (النساء: ۲۴)

”اور ان کے ماسوا جو عورتیں ہیں، وہ تمہارے لیے حلال ہیں، اس طرح کہ تم اپنے مال کے ذریعے سے انہیں طلب کرو، اس شرط کے ساتھ کہ تم پاک دامن رہنے والے ہو، نہ کہ بدکاری کرنے والے۔ (چنانچہ اس سے پہلے اگر مہر ادا نہیں کیا) تو جو فائدہ اُن سے اٹھایا ہے، اُس کے صلے میں اُن کے مہر انہیں ادا کر دو، ایک فرض کے طور پر۔ اسے فرض ٹھہرانے کے بعد، البتہ باہمی رضامندی سے جو کچھ طے کر لو تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ بے شک، اللہ علیم و حکیم ہے۔“

اس آیت میں نکاح کے لیے جو حدود و شرائط بیان ہوئے ہیں، اُن کی تفصیل یہ ہے:

پہلی بات یہ بیان ہوئی ہے کہ نکاح مال یعنی مہر کے ساتھ ہونا چاہیے۔ قرآن نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے عائد

کردہ ایک فریضہ کی حیثیت سے یہ نکاح کی ایک لازمی شرط ہے۔

... دوسری بات آیہ زیر بحث میں یہ بیان ہوئی ہے کہ نکاح کے لیے پاک دامن ہونا ضروری ہے۔ کوئی زانی یہ حق نہیں رکھتا کہ کسی عقیفہ سے بیاہ کرے اور نہ کوئی زانیہ یہ حق رکھتی ہے کہ کسی مرد عقیفہ کے نکاح میں آئے، الا یہ کہ معاملہ عدالت میں نہ پہنچا ہو اور وہ توبہ واستغفار کے ذریعے سے اپنے آپ کو اس گناہ سے پاک کر لیں۔

... اسی طرح یہ بات بھی واضح رہنی چاہیے کہ نکاح خاندان کے جس ادارے کو وجود میں لانے کے لیے کیا جاتا ہے، اُس کی حرمت کا تقاضا ہے کہ یہ والدین اور سرپرستوں کو ساتھ لے کر اور اُن کی رضا مندی سے کیا جائے۔ اس میں شبہ نہیں کہ نکاح میں فیصلہ اصلاً مرد و عورت کرتے ہیں اور اُن کے علانیہ ایجاب و قبول سے یہ منعقد ہو جاتا ہے، لیکن اولیا کا اذن اگر اُس میں شامل نہیں ہے تو اُس کی کوئی معقول وجہ لازمًا سامنے آنی چاہیے۔ یہ نہ ہو تو معاشرے کا نظم اجتماعی یہ حق رکھتا ہے کہ اس طرح کا نکاح نہ ہونے دے۔ 'لا نکاح الا بولی' (سرپرست کے بغیر کوئی نکاح نہیں) اور اس طرح کی دوسری روایتوں میں یہی بات بیان ہوئی ہے۔ عورت کی بغاوت چونکہ اس معاملے میں خاندان کے لیے غیر معمولی اختلال کا باعث بن جاتی ہے، اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و فعل سے اولیا پر واضح کر دیا ہے کہ اُس کے بارے میں وہ کوئی فیصلہ اُس کی اجازت کے بغیر نہ کریں، ورنہ عورت چاہے گی تو اُن کا یہ فیصلہ رد کر دیا جائے گا۔' (میزان ۴۱۶-۴۱۹)

درج بالا عبارت میں آپ کے سوال کا جواب موجود ہے۔ اس میں خاص آپ سے متعلق بات کو میں نے خط کشیدہ کر دیا ہے، یعنی یہ کہ نکاح کے لیے علانیہ طور پر ایجاب و قبول ضروری ہے۔ چوری چھپے کا نکاح کوئی چیز نہیں۔

متعہ

سوال کیا اسلام میں متعہ یعنی عارضی شادی کی اجازت ہے؟ اگر اجازت ہے تو پھر اس کا طریقہ کیا ہے؟ (ایم احمد)

جواب: اسلام میں عارضی شادی کی کوئی اجازت نہیں ہے۔ نکاح ایک مستقل رفاقت کا عہد ہوتا ہے۔ ارشاد باری ہے:

”وَأَنْكِحُوا الْأَيَامَىٰ مِنْكُمْ، وَالصَّالِحِينَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَإِمَائِكُمْ، إِنْ يَكُونُوا فُقَرَاءَ يُغْنِهِمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ، وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ، وَلَيْسَتْغَفِرَ الَّذِينَ لَا يَجِدُونَ نِكَاحًا حَتَّىٰ يُغْنِيَهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ“ (النور: ۲۴-۳۳).

”اور تم میں سے جو لوگ مجرد ہوں اور تمہارے لونڈی غلاموں میں سے جو صلاحیت رکھتے ہوں، اُن کے نکاح کر دو۔ اگر وہ غریب ہوں گے تو اللہ اُن کو اپنے فضل سے غنی کر دے گا اور اللہ بڑی وسعت اور بڑے علم والا ہے۔ اور جو نکاح کا موقع نہ پائیں، اُنہیں چاہیے کہ عفت اختیار کریں، یہاں تک کہ اللہ اپنے فضل سے اُن کو غنی کر دے۔“

استاذ محترم غامدی صاحب نے اپنی کتاب ”میزان“ کے باب ”قانون معاشرت“ میں ان آیات کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے:

”ان آیات میں یہ بات پوری قطعیت کے ساتھ واضح کی گئی ہے کہ عورتوں سے جنسی تسکین حاصل کرنے کا ایک ہی طریقہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک جائز ہے، اور وہ نکاح ہے۔ اس کی قدرت نہ ہو تو یہ چیز بدکاری کے جواز کے لیے عذر نہیں بن سکتی۔ چنانچہ لوگوں کو تلقین کی گئی ہے کہ اُن میں سے جو بن بیاہ رہ گئے ہوں، اُن کے نکاح کرائیں۔ علانیہ ایجاب و قبول کے ساتھ یہ مرد و عورت کے درمیان مستقل رفاقت کا عہد ہے جو لوگوں کے سامنے اور کسی ذمہ دار شخصیت کی طرف سے اس موقع پر تذکیر و نصیحت کے بعد پورے اہتمام اور سنجیدگی کے ساتھ باندھا جاتا ہے۔ الہامی صحیفوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی آدم میں یہ طریقہ اُن کی پیدائش کے پہلے دن ہی سے جاری کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ قرآن نازل ہوا تو اُس کے لیے کوئی نیا حکم دینے کی ضرورت نہ تھی۔ ایک قدیم سنت کے طور پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اپنی امت میں اسی طرح باقی رکھا ہے۔ یہاں اس کی ترغیب کے ساتھ لوگوں کو مزید یہ بشارت دی گئی ہے کہ وہ اگر غریب بھی ہوں تو اخلاقی مفاسد سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے نکاح کریں۔“ (میزان ۴۱۰)

آپ کے سوال سے متعلق الفاظ کو میں نے خط کشیدہ کر دیا ہے۔

زکوٰۃ کی رقم سے فلاحی کام

سوال: ہسپتال کی زمین خریدنے اور اس پر عمارت بنانے کے لیے ہمیں یہ بات تو واضح ہے کہ صدقے کی مد

میں وصول ہونے والی رقم استعمال کی جاسکتی ہے، لیکن زکوٰۃ کی رقم شاید اس کے لیے استعمال نہیں کی جاسکتی؟ اگر یہ بات صحیح ہے تو کیا ہم زمین خریدنے اور عمارت بنانے کے لیے زکوٰۃ کی رقم میں سے بطور قرض کچھ رقم لے سکتے ہیں؟ نیز یہ بتائیں کہ کیا ہم زکوٰۃ کی رقم اپنی 'capital cost' کے لیے استعمال کر سکتے ہیں؟ (ناصر مشتاق)

جواب: استاذ محترم غامدی صاحب کی تحقیق کے مطابق دین میں ایسی کوئی پابندی نہیں ہے۔ چنانچہ آپ صدقے کی رقم کی طرح زکوٰۃ کی رقم سے بھی زمین خرید سکتے اور اس پر عمارت بنا سکتے ہیں اور اسے ہسپتال کی چھوٹی بڑی سب ضروریات کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔

زکوٰۃ کے مصارف یعنی زکوٰۃ خرچ کرنے کی جگہوں کو خود قرآن مجید نے بیان کیا ہے۔ غامدی صاحب نے زکوٰۃ سے متعلق آیت کی شرح کرتے ہوئے قرآن کے بیان کردہ ان مصارف کو درج ذیل الفاظ میں واضح کیا ہے:

”زکوٰۃ کے مصارف سے متعلق کوئی ابہام نہ تھا۔ یہ ہمیشہ فقرا و مساکین اور نظم اجتماعی کی ضرورتوں ہی کے لیے خرچ کی جاتی تھی، لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جب منافقین نے اعتراضات کیے تو قرآن نے انھیں خود پوری وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا۔ ارشاد فرمایا ہے:

إِنَّمَا الصَّدَقَتُ لِلْفُقَرَاءِ، وَالْمَسْكِينِ، وَالْعَمِلِينَ عَلَيْهَا، وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ، وَفِي الرِّقَابِ، وَالْغَرَمِينَ، وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ، وَأَبْنِ السَّبِيلِ، فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ، وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ.

(التوبہ: ۶۰)

”یہ صدقات تو بس فقیروں اور مسکینوں کے لیے ہیں، اور اُن کے لیے جو ان پر عامل بنائے جائیں، اور اُن کے لیے جن کی تالیف قلب مطلوب ہو، اور اس لیے کہ گردنوں کے چھڑانے اور تاوان زدوں کی مدد کرنے میں، راہ خدا میں اور مسافروں کی بہبود کے لیے خرچ کیے جائیں۔ یہ اللہ کا مقرر کردہ فریضہ ہے اور اللہ علیم و حکیم ہے۔“

اس آیت میں جو مصارف بیان کیے گئے ہیں، اُن کی تفصیل یہ ہے:

فقرا و مساکین کے لیے۔

’العاملین علیہا‘، یعنی ریاست کے تمام ملازمین کی خدمات کے معاوضے میں۔

’المؤلفة قلوبہم‘، یعنی اسلام اور مسلمانوں کے مفاد میں تمام سیاسی اخراجات کے لیے۔

’فی الرقاب‘، یعنی ہر قسم کی غلامی سے نجات کے لیے۔

’الغارمین‘، یعنی کسی نقصان، تاوان یا قرض کے بوجھ تلے دبے ہوئے لوگوں کی مدد کے لیے۔

’فی سبیل اللہ‘ یعنی دین کی خدمت اور لوگوں کی بہبود کے کاموں میں۔
 ’ابن السبیل‘ یعنی مسافروں کی مدد اور اُن کے لیے سڑکوں، پلوں، سراؤں وغیرہ کی تعمیر کے لیے۔
 ... زکوٰۃ کے مصارف پر تملیک ذاتی کی جو شرط ہمارے فقہانے عائد کی ہے، اُس کے لیے کوئی ماخذ قرآن و سنت میں موجود نہیں ہے، اس وجہ سے زکوٰۃ جس طرح فرد کے ہاتھ میں دی جاسکتی، اُسی طرح اُس کی بہبود کے کاموں میں بھی خرچ کی جاسکتی ہے۔‘ (میزان ۳۵۱-۳۵۲)
 غامدی صاحب کی تحریر میں آپ کے سوال سے متعلق حصہ میں نے نشان زد کر دیا ہے۔

قضا نمازوں کا فدیہ

سوال: کیا کسی آدمی کی وفات کے بعد اس کی طرف سے ہم اس کی چھوٹی ہوئی نمازوں کے عوض صدقہ دے سکتے ہیں؟ (شمر کاظمی)

جواب: نہیں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔
 پہلی بات تو یہ ہے کہ جیسے کوئی بوڑھا آدمی جو روزہ نہ رکھ سکتا ہو، وہ اپنے روزہ چھوڑنے کے عوض فدیہ دے سکتا ہے۔ اس طرح کا کوئی فدیہ چھوٹی ہوئی نماز کے لیے نہیں دیا جاسکتا، کیونکہ یہ بات دین میں ثابت نہیں ہے۔
 دوسری بات یہ ہے کہ کسی کے لیے کوئی دوسرا شخص نیک عمل نہیں کر سکتا۔

اپنی مرنیہ کی بیٹی سے شادی

سوال: مجھے درج ذیل سوالات کی وضاحت مطلوب ہے:
 پہلا یہ کہ اگر کسی لڑکے نے کسی شادی شدہ عورت سے زنا کیا ہے تو کیا وہ اس عورت کی بیٹی سے شادی کر سکتا ہے؟

دوسرا یہ کہ اگر اس لڑکے کا معاملہ اس عورت کے ساتھ زنا کے قریب، یعنی بوس و کنار وغیرہ تک تو پہنچا ہو، البتہ اس نے زنا نہ کیا ہو تو کیا اس صورت میں وہ اس عورت کی بیٹی سے شادی کر سکتا ہے؟

تیسرا یہ کہ اگر زنا یا محض بوس و کنار کے زمانے میں وہ لڑکا تو نابالغ ہو اور عورت شادی شدہ ہو تو کیا اس صورت میں وہ اس عورت کی بیٹی سے شادی کر سکتا ہے؟ (محمد عاشق)

جواب: استاذ محترم غامدی صاحب کی تحقیق کے مطابق درج بالا تینوں صورتوں میں وہ لڑکا اس عورت کی بیٹی سے شادی کر سکتا ہے۔

احناف کے نزدیک تینوں صورتوں میں یہ شادی ناجائز ہوگی جبکہ شوافع کے نزدیک تینوں صورتوں میں یہ جائز ہے۔

اسبال ازار

سوال کیا نماز سے پہلے ٹخنوں سے اوپر شلوار کرنا نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے؟ (عرفان محمود)

جواب: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ دیکھا کہ لوگ اپنا ازار، یعنی تہ بند متکبرانہ انداز میں ٹخنوں سے نیچے لٹکائے زمین پر گھسیٹتے ہوئے چلتے ہیں تو آپ نے اپنے صحابہ کو یہ حکم دیا کہ وہ اپنا تہ بند ٹخنوں سے اوپر رکھا کریں اور یہ بتایا کہ جو شخص تکبر کی وجہ سے اپنا تہ بند زمین پر گھسیٹتے ہوئے چلتا ہوگا، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی طرف دیکھے گا بھی نہیں اور اس کا جو کپڑا ٹخنوں سے نیچے ہوگا، وہ آگ میں ہوگا۔

چنانچہ صحابہ کرام نے نہ صرف لباس کی اس متکبرانہ صورت کو بالکل ترک کیا، بلکہ تکبر کے ذہن کے بغیر بھی اس صورت کو اختیار کرنے سے مکمل گریز کیا، کیونکہ یہ بہر حال اظہار تکبر ہی کی ایک صورت ہے۔

آج بھی اگر کوئی شخص اپنا تہ بند متکبرانہ انداز میں ٹخنوں سے نیچے لٹکائے زمین پر گھسیٹتا ہوا چلتا ہے تو وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اسی وعید کا مخاطب ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ آج کل شلوار کا ٹخنوں سے ذرا نیچے رکھا جانا کیا متکبرانہ لباس کی شکل ہے؟ ہمارا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ تہ بند کو نیچے لٹکانا اور زمین پر گھسیٹتے ہوئے چلنا لباس کی واقعہ متکبرانہ صورت اور علامت ہے، جبکہ شلوار کی عام رائج صورت کا معاملہ بالکل یہ نہیں۔

چنانچہ ہمارے خیال میں تہ بند لٹکا کر گھسیٹتے ہوئے چلنے سے متعلق حکم شلوار وغیرہ کی عام رائج صورت پر لاگو نہیں

ہوتا۔

مجبوراً رشوت لینا

سوال کیا کوئی غریب ملازم اپنے ضروری اخراجات پورے کرنے کے لیے رشوت لے سکتا ہے؟ اسلام کی رہنمائی کے مطابق اپنے نقطہ نظر سے آگاہ کیجیے۔ (عبداللہ)

جواب: رشوت کی اجازت دینا قانون کو بیچنے کی اجازت دینا ہے۔ اسلام میں اس کی کوئی گنجائش نہیں۔ ہاں، اگر کسی مجبور شخص سے ایسی غلطی ہو جائے تو ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے عذر کو قبول کر کے اسے معاف فرما دیں۔

اس رشوت لینے کو کسی جاں بلب بھوکے شخص کو حرام غذا کھانے کی اجازت پر قیاس نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ حرام جانور نہ کھانا خدا کا حق ہے جسے وہ (اللہ) بھوکے شخص کے لیے چھوڑ دیتا ہے، جبکہ رشوت لینا لوگوں کے یا قوم کے حقوق بیچنا ہے۔ اس کی اجازت اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک وہ لوگ یا قوم اجازت نہ دے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ آمدنی بڑھانے کے دوسرے ذرائع اختیار کرنے کی کوشش کرے اور خدا سے برکت کی دعا کرے۔